© rasailojaraid.com

مسئلے کے متعلق آیاتِ قرآنی اور احادیثِ صحیحہ درج کریں گے اور پھر ساتھ ساتھ یہ بھی بتلاتے جائیں گے کہ ان سے کیا احکام نکلتے ہیں۔

(۱)

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ (یوسف ۵)

حکم نہیں ہے مگر صرف اللہ کے لیے، اس کا فرمان ہے کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اس کی، یہی صحیح دین ہے۔

یہ آیت صراحت کرتی ہے کہ فیصلہ کرنے کا اختیار اور فرماں روائی کا حق (بالفاظِ دیگر "حاکمیت") اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی لفظی یا قرینہ ایسا موجود نہیں ہے جس کی بنا پر اس حاکمیت کو محض "کائناتی حاکمیت" (Universal Sovereignty) کے مفہوم میں مقید کر دیا جائے۔ اللہ کی یہ حاکمیت جس طرح کائناتی ہے اسی طرح سیاسی و قانونی بھی ہے اور اخلاقی و اعتقادی بھی۔ اور خود قرآن مجید میں ان تمام اقسام کی حاکمیتوں کے اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہونے کی واضح دلیلیں موجود ہیں۔ چنانچہ قرآن تصریح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف رب الناس اور الٰہ الناس ہی نہیں ہے بلکہ ملک الناس بھی ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ۔

کہو اے محمد کہ میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ اور انسانوں کے معبود کی

وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ملک کا مالک ہے اور بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے:۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ۔ (آل عمران ۳)

کہو، خدایا، ملک کے مالک، تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے

لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (بنی اسرائیل ۱۲)

بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

پھر وہ صاف صاف کہتا ہے کہ امر کا حق صرف اللہ کو ہے اس لیے کہ پیدا کرنے والا وہی ہے۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف ۷)

خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا۔

ظاہر ہے کہ یہ محض کائناتی حاکمیت نہیں بلکہ صریحاً سیاسی حاکمیت ہے اور اسی بنا پر قرآن قانونی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاکمیت کو بھی اللہ کے لیے مخصوص کرتا ہے:-

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (اعراف - ۱)

پیروی کرو اس چیز کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور نہ پیروی کرو اسے چھوڑ کر دوسرے کارسازوں کی۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (المائدہ - ۷)

اور جو لوگ فیصلہ نہ کریں اس قانون کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے وہی کافر ہیں۔

اللہ کی سیاسی اور قانونی حاکمیت کا یہ تصور اسلام کے اولین بنیادی اصولوں میں سے ہے اور شروع سے آج تک تمام فقہائے اسلام اس پر متفق ہیں کہ حکم دینے کا حق اللہ کے لیے خاص ہے۔ چنانچہ علامہ آمدی اصولِ فقہ کی مشہور کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

اعلم انہ لا حاکم سوی اللہ ولا حکم الا ما حکم بہ۔

جان لو کہ حاکم اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے، اور حکم بس وہ ہے جو اللہ نے دیا ہے۔

اور شیخ محمد خضری اپنی اصول الفقہ میں اس کو جمیع اہلِ اسلام کا متفقہ عقیدہ قرار دیتے ہیں:

ان الحکم ھو خطاب اللہ، فلا حکم الا للہ وھذہ قضیۃ اتفق علیھا المسلمون قاطبۃ۔

درحقیقت "حکم" اللہ کے فرمان کو کہتے ہیں پس حکم دینے کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمان متفق ہیں۔

پس کوئی اسلامی دستور اس کے بغیر نہیں بن سکتا کہ اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی سیاسی اور قانونی حاکمیت کا اقرار کیا جائے اور بالفاظِ صریح یہ لکھا جائے کہ یہ ریاست اللہ کی مطیع ہے، اس کو حاکمِ اعلیٰ تسلیم کرتی ہے اور اس کے احکام کو واجب العمل مانتی ہے۔

(۲)

انبیاء علیہم السلام بالعموم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بالخصوص اللہ تعالیٰ کی اس سیاسی و قانونی حاکمیت کے مظہر ہیں یعنی اللہ کی اس حاکمیت کا نفاذ انسانوں میں جس واسطے سے ہوتا ہے وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واسطے اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اس لیے ان کے حکم کی اطاعت اور ان کے طریقے کی پیروی اور ان کے فیصلوں کو بے چون و چرا ماننا ہر اس فرد اور گروہ اور قوم کے لیے لازم ہے جو اللہ کی اس حاکمیت کو تسلیم کرے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء۔۱۱)

جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء۔۹)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء۔۱۶)

اے محمدؐ، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس روشنی میں حکم کرو جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر۔۱)

اور جو کچھ رسول تم کو دیں اسے لے لو اور جس سے تم کو روک دیں اس سے رک جاؤ۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء۔۹)

پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے اختلاف میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تو فیصلہ دے اس پر اپنے نفس میں تنگی تک نہ محسوس کریں اور سر بسر تسلیم کر لیں۔

یہ ایک اسلامی ریاست کے دستور کی دوسری بنیاد ہے۔ اس میں اللہ کی حاکمیت کے اقرار کے بعد دوسرا اقرار یہ ہونا چاہیے کہ اس ریاست میں کتاب اللہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ کو بھی ماخذ قانون کی حیثیت حاصل ہوگی اور اس کی انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ میں سے کسی کو بھی سنت کے خلاف احکام دینے، قانون بنانے اور فیصلے کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔

(۳)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ (النور - ۷)

ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کیا ہے کہ وہ ضرور ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں (مومنین صالحین) کو خلیفہ بنایا تھا۔

یہ آیت دو اہم دستوری نکات کی تصریح کرتی ہے۔ اوّل یہ کہ ایک اسلامی ریاست کا صحیح مقام "خلافت" ہے نہ کہ "حاکمیت"۔ دوم یہ کہ ایک اسلامی ریاست میں خلافت کا حامل کوئی ایک شخص یا خاندان یا طبقہ نہیں ہوتا بلکہ وہ پوری امتِ مسلمہ اس کی حامل ہوتی ہے جسے اللہ نے آزاد ریاست عطا کی ہو۔

پہلے نکتے کی تشریح یہ ہے کہ حاکمیت اپنی عین حقیقت ہی کے اعتبار سے اس امر کی متقاضی ہے کہ صاحبِ حاکمیت کی اپنی ذات سے خارج کوئی ایسی طاقت نہ ہو جو اس کے اختیارات کو محدود کرتی ہو اور اس کو خود اس کے اپنے بنائے ہوئے قوانین وضوابط کے سوا کچھ اوپر سے مسلط کیے ہوئے قوانین وضوابط کا پابند بناتی ہو۔ اب اگر ایک ریاست پہلے ہی قدم پر یہ مان لے کہ خدا اور رسول کا حکم اس کے لیے بالاتر قانون کی حیثیت رکھتا ہے جس کے خلاف نہ اس کی منتظمہ کام کر سکتی ہے، نہ اس کی مقننہ کوئی قانون بنا سکتی ہے، اور نہ اس کی عدلیہ کوئی فیصلہ کر سکتی ہے، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خدا اور رسول کے مقابلے میں حاکمیت کے دعوے سے دست بردار ہو گئی ہے اور اس نے حکمرانی میں دراصل خدا اور رسول کے ایجنٹ (خلیفہ) کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس صورت میں اس کے لیے صحیح اصطلاح "حاکمیت" نہیں بلکہ "خلافت" ہی ہو سکتی ہے، ورنہ اس حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے لیے حاکمیت کا لفظ استعمال کرنا محض ایک تناقض فی الاصطلاح ہو گا۔ البتہ اگر وہ اپنی خود مختاری کو خدا کے حکم اور رسول کی سنت کے اتباع سے مقید نہ کرے تو بلاشبہ اس کی صحیح پوزیشن "حاکمیت" ہی کی ہو گی، مگر اس صورت میں اس کے لیے "اسلامی ریاست" کی اصطلاح استعمال کرنا تناقض فی الاصطلاح ہو گا۔

دوسرے نکتے کی تشریح یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں اس کے تمام مسلم باشندوں کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بحیثیتِ مجموعی حاملِ خلافت ہونا وہ اہم اصولی حقیقت ہے جس پر اسلام میں جمہوریت کی بنا رکھی گئی ہے۔
جس طرح غیر اسلامی جمہوریت کی بنیاد اجتماعی حاکمیت (**Popular Sovereignty**) کے اصول پر قائم ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح اسلامی جمہوریت کی بنیاد اجتماعی خلافت (**Popular Vicegerency**) کے اصول پر قائم ہوتی ہے۔ اس نظام میں حاکمیت کے بجائے خلافت کی اصطلاح تو اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ یہاں اقتدار خدا کا عطیہ ہے اور اس عطیے کو خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر ہی استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن خلافت کا یہ محدود اقتدار، قرآن کی مذکورہ بالا تصریح کی رو سے، کسی ایک شخص یا طبقے کو نہیں بلکہ ریاست کے تمام مسلمانوں کو من حیث الجماعت سونپا گیا ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ حکومت مسلمانوں کی مرضی سے بنے، ان کے مشورے سے کام کرے، اور اسی وقت تک حکمراں رہے جب تک مسلمان اس سے راضی رہیں۔ اسی بنا پر حضرت ابوبکرؓ نے خلیفۃ اللہ کہلانے سے انکار کیا تھا۔ کیونکہ خلافت دراصل امتِ مسلمہ کو سونپی گئی تھی نہ کہ براہِ راست اُن کو۔ اُن کی خلافت کی اصل حیثیت یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی مرضی سے اپنے اختیاراتِ خلافت ان کے سپرد کیے تھے۔

اِن دونوں نکات کو ملحوظ رکھ کر اسلامی ریاست کا دستور ایسا بنایا جانا چاہیے جو حاکمیت کے دعوے سے خالی ہو اور جس میں صریح طور پر ریاست کی حیثیت خلافت نمایاں نظر آتی ہو۔

(۴)

اجتماعی خلافت کے مذکورۂ بالا تقاضے کو قرآن اِن الفاظ میں واضح طور پر بیان کرتا ہے:۔
وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ ۴)   اور اُن کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے۔

اس آیت میں اسلامی نظامِ زندگی کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ اس میں تمام اجتماعی امور مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ یہ صرف بیانِ خصوصیت ہی نہیں ہے بلکہ اپنے فحوائے کلام کے لحاظ سے حکم بھی ہے اور اس بنا پر کسی اجتماعی کام کو مشورے کے بغیر انجام دینا ممنوع ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ

قلت یا رسول اللہ الامر ینزل بنا   میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کے بعد کوئی معاملہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعدك لم ینزل فیه قرآن ولم یسمع منك فیه شیٔ، قال اجمعوا العابدین من امتی و اجعلوہ بینکم شوریٰ ولا تقضوا برای واحد (روح المعانی)

ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو؟ فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار لوگوں کو جمع کرو اور اسے آپس کے مشورے کے لیے رکھ دو اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

پھر اس شوریٰ کی اصل روح کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:۔

من اشار علی اخیه بامر یعلم ان الرشد فی غیرہ فقد خانه۔ (ابوداؤد)

جس نے اپنے بھائی کو کسی ایسی بات کا مشورہ دیا جس کے متعلق وہ خود جانتا ہو کہ صحیح بات دوسری ہے، تو اس نے دراصل اس کے ساتھ خیانت کی۔

یہ حکم نہایت وسیع الفاظ میں ہے اور اس میں شوریٰ کی کوئی خاص شکل معین نہیں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے احکام ساری دنیا کے لیے ہیں اور ہمیشہ کے لیے ہیں۔ اگر شوریٰ کا کوئی خاص طریقہ مقرر کر دیا جاتا تو وہ عالمگیر اور ابدی نہ ہو سکتا۔ شوریٰ براہ راست تمام لوگوں سے ہو، یا لوگوں کے نمائندوں سے؟ نمائندے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوں یا خواص کے ووٹوں سے؟ انتخاب مملکت گیر ہو یا صرف صدر مقام میں؟ انتخاب الیکشن کی صورت میں ہو یا ایسے لوگ لے لیے جائیں جن کی نمائندہ حیثیت معلوم و معروف ہو؟ مجلس شوریٰ یک ایوانی ہو یا دو ایوانی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا ایک جواب ہر سوسائٹی اور ہر تمدن کے لیے یکساں موزوں نہیں ہو سکتا۔ ان کے جواب کی مختلف صورتیں مختلف حالات کے لیے موزوں ہو سکتی ہیں اور حالات کی تبدیلی سے نئی نئی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اس لیے شریعت نے ان امور کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔ نہ کسی خاص شکل کا تعین کیا ہے اور نہ کسی خاص شکل کو ممنوع ہی قرار دیا ہے۔ البتہ اصولاً اوپر کی آیت اور اس کی توضیح کرنے والی احادیث میں تین باتیں لازم کر دی گئی ہیں:

(۱) مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کام مشورے کے بغیر انجام نہ پانا چاہیے۔ یہ چیز ملوکیت کی جڑ کاٹ دیتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ اس لیے کہ حکومت کے معاملات میں سب سے اہم معاملہ تو خود رئیس حکومت کا تقرر ہے۔ اگر دوسرے معاملات میں مشورہ لازم ہے تو رئیس حکومت کا زبردستی مسلط ہو جانا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ چیز ڈکٹیٹر شپ کو بھی ممنوع ٹھیراتی ہے۔ کیونکہ ڈکٹیٹر شپ کے معنی استبداد کے ہیں، اور استبداد شوریٰ کی ضد ہے۔ اسی طرح دستور کو عارضی طور پر معطل کرنے کے اختیارات بھی اس حکم کی موجودگی میں رئیس مملکت کو نہیں دیئے جا سکتے، کیونکہ تعطل کے دور میں لامحالہ وہ استبداد سے کام کرے گا اور استبداد ممنوع ہے۔

(۲) معاملہ جن لوگوں کے اجتماعی کام سے متعلق ہو ان سب کو مشورے میں شریک ہونا چاہیے، خواہ وہ براہ راست شریک ہوں یا اپنے معتمد علیہ نمائندوں کے واسطے سے شریک ہوں۔

(۳) مشورہ آزادانہ اور بے لاگ اور مخلصانہ ہونا چاہیے۔ دباؤ اور لالچ کے تحت ووٹ یا مشورہ لینا دراصل مشورہ نہ لینے کا ہم معنی ہے۔

پس دستور کی تفصیلات خواہ کچھ ہوں، اس میں شریعت کے یہ تینوں اصول بہرحال ملحوظ رہنے چاہئیں اس میں ایسی کوئی گنجائش نہ رکھی جانی چاہیے کہ کسی وقت بھی عوام سے یا ان کے معتمد علیہ نمائندوں سے مشورہ لیے بغیر حکومت کی جانے لگے۔ اس میں انتخابات کا ایسا نظام تجویز کیا جانا چاہیے جس سے پوری قوم شریک مشورہ ہو سکے۔ اور اس میں ان اسباب کا سدِ باب ہونا چاہیے جن کے زیر اثر عوام سے یا ان کے نمائندوں سے خوف یا لالچ یا فریب کے تحت رائے لینا ممکن ہو۔

(۵)

رئیس حکومت، وزراء، اہلِ شوریٰ، اور حکام کے انتخاب میں کیا امور ملحوظ رہنے چاہئیں، اس باب میں قرآن اور سنت کی ہدایات یہ ہیں:-

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۔ (النساء - ۸)	اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں یعنی اعتماد کی ذمہ داریاں، اہل امانت (یعنی امین لوگوں) کے سپرد کرو۔
اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ	درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(الحجرات - ۲)

وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

خیار ائمتکم الذین تحبونهم ویحبونکم وتصلون علیهم ویصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تبغضونهم ویبغضونکم وتلعنونهم ویلعنونکم (رواہ مسلم)

تمہارے بہترین سردار وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں اور جن کو تم دعا دو اور وہ تمہیں دعا دیں۔ اور تمہارے بدترین سردار وہ ہیں جن سے تم نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں اور جن پر تم لعنت بھیجو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں۔

انا واللہ لا نولی علی عملنا هذا احداً سأله او حرص علیه (متفق علیه)

خدا کی قسم ہم اپنی اس حکومت کے کسی کام پر کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کرتے جو اس کی درخواست کرے یا اس کا حریص ہو۔

ان اخونکم عندنا من طلبه (ابوداؤد)

ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ شخص ہے جو اس کا خود طالب ہو۔

حدیث سے گزر کر یہ بات تاریخ کے صفحات پر بھی ثبت ہو چکی ہے کہ اسلام میں عہدوں کی طلب سخت ناپسندیدہ چیز ہے۔ چنانچہ قلقشندی اپنی کتاب صبح الاعشیٰ میں بیان کرتا ہے:-

وقد أُثر عن ابی بکر انه قال سألت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم عن هذا الامر فقال لی یا ابا بکر هو لمن یرغب عنه لا لمن یتجاحش علیه ولمن یتضاءل عنه لا لمن یتنفج الیه۔ هو لمن یقال هو لك لا لمن یقول هو لی (صبح الاعشیٰ للقلقشندی ج ۱ - ص ۲۴۰)

حضرت ابوبکر سے ماثور ہے کہ آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے امارت کے بارے میں دریافت کیا تو حضور نے جواب دیا اے ابوبکر وہ اس کے لیے ہے جو اس سے بے رغبت ہو نہ کہ اس کے لیے جو اس پر ٹوٹا پڑتا ہو۔ وہ اس کے لیے ہے جو اس سے بچنے کی کوشش کرے نہ کہ اس کے لیے جو اس پر جھپٹے۔ وہ اس کے لیے ہے جس سے کہا جائے کہ یہ تیرا حق ہے نہ کہ اس کے لیے جو خود کہے کہ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میرا حق ہے۔[1]

یہ ہدایات اگرچہ محض اصولی ہدایات ہیں۔ ان میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ مطلوبہ صفات کے سرداروں اور نمائندوں کو منتخب کرنے، اور ناپسندیدہ لوگوں کو روکنے کے لیے مشینری کیا ہو، لیکن بہرحال یہ وقت کے دستور سازوں کا کام ہے کہ ان ہدایات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مناسب عملی تدابیر تجویز کریں۔ انہیں انتخاب کا ایسا نظام سوچنا چاہیے جس سے امین اور متقی اور عوام کے محبوب اور خیرخواہ لوگ منتخب ہوسکیں اور وہ لوگ نہ اُبھرنے پائیں جو عوام کے ووٹ لیکر بھی اُن کے مبغوض بنے رہتے ہیں جن پر ہر طرف لعنت کی بوچھاڑ ہوتی رہتی ہے، جن کے حق میں لوگ بددعائیں کرتے ہیں، اور جنہیں عہدے پیش نہیں کیے جاتے بلکہ وہ خود عہدوں پر جھپٹتے ہیں۔

(۶)

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (النساء-۴) مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

لن یفلح قوم ولّوا امرھم امراۃ (بخاری) وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جو اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کرے۔

یہ دونوں نصوص اس باب میں قاطع ہیں کہ مملکت میں ذمہ داری کے مناصب (خواہ وہ صدارت ہو، یا وزارت، یا مجلسِ شوریٰ کی رکنیت، یا مختلف محکموں کی ادارت) عورتوں کے سپرد نہیں کیے جاسکتے۔ اس لیے کسی اسلامی ریاست کے دستور میں عورتوں کو یہ پوزیشن دینا، یا اس کے لیے گنجائش رکھنا نصوصِ صریحہ کے خلاف ہے اور اطاعتِ خدا و رسول کی پابندی قبول کرنے والی ریاست اس خلاف ورزی کی سرے سے مجاز ہی نہیں ہے۔[2]

---

[1] یہ اثر اگرچہ کسی حدیث کی کتاب میں ہمیں ان الفاظ میں نہیں ملا ہے۔ بلکہ یہ ایک مورخ کا بیان ہے لیکن ہم نے اس بنا پر اسے نقل کر دیا ہے کہ حدیث کی دو مستند روایتیں اسی معنی میں اوپر نقل کی جا چکی ہیں۔ اس طرح کی کمزور روایتیں معنی کے اعتبار سے قوی ہو جاتی ہیں جبکہ ان کی تائید میں صحیح روایات موجود ہوں۔

[2] اس مسئلے کی تشریح ہم ایک مستقل مضمون میں کر چکے ہیں جو ستمبر ۱۹۵۲ء کے ترجمان القرآن میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے یہاں ہم نے اس کے پورے دلائل جمع نہیں کیے ہیں بلکہ صرف حکم بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

(۷)

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج -۶)

جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اس آیت میں اسلامی حکومت کے مقصد وجود اور اس کے بنیادی فرائض کا ذکر کیا گیا ہے۔ کافر حکومتوں کی طرح اس کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ ملک کے اندرونی امن اور خارجی سرحدوں کی حفاظت کرے، اور ملک کی مادّی خوشحالی کے لیے ساعی ہو، بلکہ ایک اسلامی حکومت ہونے کی حیثیت سے اس کا اوّلین فریضہ یہ ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرے، اور اُن بھلائیوں کو فروغ دے جنہیں خدا اور رسول بھلائی قرار دیتے ہیں، اور اُن برائیوں کو روکے جنہیں خدا اور رسول برائی کہتے ہیں۔ کوئی ایسی حکومت اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی جو اس بات سے بے پروا ہو کہ نماز قائم ہو رہی ہے یا نہیں، زکوٰۃ دی جا رہی ہے یا نہیں، بھلائیاں پھیل رہی ہیں یا مٹ رہی ہیں، اور برائیاں دب رہی ہیں یا ابھر رہی ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام ایسی حکومت کو زیب نہیں دیتا جس کے حدود میں زنا، اور شراب، اور قمار بازی، اور فحش لٹریچر، اور فحش تماشوں، اور فحش گانوں، اور مخلوط تعلیم، اور تبرّج جاہلیت، اور اختلاط مرد و زن کا عام رواج ہو اور ان صریح منکرات پر کوئی قدغن نہ ہو۔ پس ایک اسلامی دستور میں لازماً ریاست کو ان فرائض کا پابند ہونا چاہیے جنہیں قرآن اس کے بنیادی فرائض میں شمار کرتا ہے۔

(۸)

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں پھر اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان نزاع ہو تو اس کو اللہ اور رسول

© rasailojaraid.com

الآخِرِ، ذَالِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاوِيْلًا۔ (النساء - ۸)

کی طرف پھیرو اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔ یہ بہتر ہے اور بلحاظ انجام بھی اچھا ہے۔

اس آیت میں تین نہایت اہم بنیادی نکات بیان کیے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک کا گہرا تعلق دستوری مسائل سے ہے:۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت وہ اصل اطاعت ہے جس کا ہر مسلمان فرد کو بحیثیت فرد اور مسلمان قوم کو بحیثیت قوم پابند ہونا چاہیے۔ یہ اطاعت ہر دوسری اطاعت پر مقدم ہے۔ اولی الامر کی اطاعت اس کے بعد ہے نہ کہ اس سے پہلے، اور اس کے تحت ہے نہ کہ اس سے آزاد۔ اس نکتے کی مزید وضاحت حسب ذیل آیات اور احادیث میں ہم کو ملتی ہے

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب - ۵)

کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب کسی معاملے کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول کر دے تو پھر ان کے لیے خود اپنے اس معاملے میں فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہ جائے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ . . . فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ . . . . فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (المائدہ - ۷)

اور جو فیصلہ نہ کریں اس قانون کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے وہی کافر ہیں - - - - - وہی ظالم ہیں . . . . وہی فاسق ہیں۔

السمعُ والطاعةُ على المرءِ المسلمِ فيما احبَّ وكره مالم يؤمر بمعصيةٍ فاذا اُمِرَ بمعصيةٍ فلا سمعَ ولا طاعةَ (بخاری ومسلم)

ایک مسلمان پر سمع و طاعت لازم ہے خواہ برضاء رغبت کرے یا بکراہت تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ پھر جب اس کو معصیت کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے نہ طاعت۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان امر علیکم عبد مجدع یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا واطیعوا (مسلم)	اگر تم پر کوئی نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔
لاطاعۃ فی معصیۃ انما الطاعۃ فی المعروف (بخاری و مسلم)	معصیت میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت تو صرف معروف میں ہے۔
لاطاعۃ لمن عصی اللہ (طبرانی)	کوئی اطاعت اس شخص کے لیے نہیں ہے جو اللہ کا نافرمان ہو۔
لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (شرح السنہ)	خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔

کتاب و سنت کے یہ تمام محکمات اس باب میں ناطق ہیں کہ ایک اسلامی ریاست میں مجلس قانون ساز کوئی ایسا قانون بنانے کا حق نہیں رکھتی جو اللہ اور رسول کے احکام کے خلاف ہو، اور اگر وہ ایسا کوئی قانون بنا دے تو وہ رد کر دیئے جانے کے لائق ہے نہ کہ نافذ ہونے کے لائق۔ اسی طرح یہ آیات اور احادیث اس باب میں بھی ناطق ہیں کہ ایک اسلامی ریاست کی عدالتوں میں اللہ اور رسول کا قانون لازماً نافذ ہونا چاہیے اور جو بات کتاب و سنت کی دلیل سے حق ثابت کر دی جائے اسے کوئی جج اس بنا پر رد نہیں کر سکتا کہ لیجسلیچر کا بنایا ہوا قانون اس کے خلاف ہے۔ تصادم کی صورت میں اللہ اور رسول کا قانون نہیں بلکہ لیجسلیچر کا قانون حدود دستور سے خارج قرار پانا چاہیے۔ اسی طرح یہ آیات اور احادیث اس باب میں بھی ناطق ہیں کہ اسلامی ریاست کی انتظامیہ کو ایسا کوئی حکم دینے یا ضابطہ بنانے کا حق نہیں ہے جس سے خدا اور رسول کی معصیت لازم آتی ہو۔ اگر وہ ایسا کوئی حکم دے اور لوگ اس کی اطاعت نہ کریں تو وہ مجرم نہیں ہوں گے، بلکہ اس کے برعکس، خود حکومت زیادتی کی مرتکب ہو گی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں اولی الامر مسلمان ہی ہو سکتے ہیں۔ اس کی دو دلیلیں تو خود اس آیت ہی میں موجود ہیں۔ اول یہ کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فرمانے کا کوئی مطلب اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ جن اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وہ مسلمانوں ہی میں سے ہونے چاہئیں۔ دوم یہ کہ نزاع کی صورت میں متنازع فیہ معاملے کو اللہ اور رسول کی طرف پھیرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ رعایا اور حکومت کی نزاع میں اللہ اور رسول کو حَکَم صرف مسلمان اولی الامر ہی مان سکتے ہیں نہ کہ کافر اولی الامر۔ مزید برآں مستند احادیث کی تصریحات بھی اسی کی تائید بلکہ تاکید کرتی ہیں۔ چنانچہ ابھی اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات نقل ہو چکے ہیں کہ "اگر ایک نکٹا غلام بھی تم پر امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔" اور یہ کہ "کوئی اطاعت اس شخص کے لیے نہیں ہے جو اللہ کا نافرمان ہو۔" ایک اور حدیث میں حضرت عُبادہ بن صامت روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اس بات پر بیعت لی تھی کہ:-

اَن لا ننازع الامر اھلہٗ الا ان	ہم اپنے حکمرانوں سے جھگڑا نہ کریں گے اِلّا یہ کہ ہم
تروا کفراً بواحاً عندکم من اللہ	ان کے کاموں میں کھلا کھلا کفر دیکھیں جو ہمارے پاس
فیہ برھان (بخاری ومسلم)	ان کے خلاف اللہ کی طرف سے دلیل ہو۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب صحابہ کرام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بُرے حاکموں کے خلاف بغاوت کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا:-

لا ما اقاموا فیکم الصلوٰۃ (مسلم)	نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے ہیں

ان تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے صاحب امر بننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک اشتراکی ریاست میں منکرینِ اشتراکیت، اور ایک جمہوری ریاست میں مخالفینِ جمہوریت کے لیے اولی الامر بننے کا نہ عقلاً کوئی موقع ہے نہ عملاً۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے مسلمان اپنے اولی الامر سے نزاع کا حق رکھتے ہیں اور نزاع کی صورت میں فیصلہ جس چیز پر چھوڑا جائے گا وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہوگی۔ یہ آخری سند جس کے حق میں بھی فیصلہ دے اسے ماننا پڑے گا خواہ فیصلہ اولی الامر کے حق میں ہو یا رعایا کے حق میں۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ اس حکم کا تقاضا پورا کرنے کے لیے کوئی ادارہ ایسا ہونا چاہیے جس کے پاس نزاع لے جائی جائے اور جس کا کام یہ ہو کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے مطابق اس نزاع کا فیصلہ کرے۔ یہ ادارہ خواہ کوئی مجلس علماء ہو یا سپریم کورٹ یا کوئی اور، اس کے تعین کی کسی خاص شکل پر شریعت نے ہمیں مجبور نہیں کر دیا ہے۔ مگر بہرحال ایسا کوئی ادارہ مملکت میں ہونا چاہیے، اور اس کو یہ حیثیت حاصل ہونی چاہیے کہ انتظامیہ اور مقننہ اور عدلیہ کے احکام اور فیصلوں کے خلاف اس کے پاس مرافعہ کیا جا سکے۔ اور اس کا بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ کتاب و سنت کی ہدایات کے مطابق وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرے۔

(۹)

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ۔ (النساء ۔ ۸)	اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان حکم دیا فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۔ (المائدہ ۲)	اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو، یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔

یہ آیات اگرچہ وسیع ترین مفہوم میں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر عدل کا پابند بناتی ہیں، مگر ظاہر ہے کہ ان کے اِس تقاضے سے اسلامی ریاست آزاد نہیں ہو سکتی۔ لامحالہ اُس کو بھی عدل ہی کا پابند ہونا چاہیے، بلکہ اسے تو بدرجۂ اولیٰ ہونا چاہیے، کیونکہ حکم بین الناس کا سب سے زیادہ طاقتور ادارہ وہی ہے اور اگر اس کے حکم میں عدل نہ ہو تو پھر معاشرے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور کہیں عدل نہیں ہو سکتا۔

اب دیکھیے کہ جہاں تک ریاست کا تعلق ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی سنت سے حکم بین الناس میں عدل برتنے کا کیا طریقہ ثابت ہوتا ہے۔

(۱) حجۃ الوداع کے مشہور خطبے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کے جن بنیادی اصول کا اعلان فرمایا تھا ان میں ایک اہم اصول یہ بھی تھا:

فان دماءکم واموالکم واعراضکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا

یقیناً تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی محترم ہیں جیسے آج حج کا یہ دن محترم ہے۔

اس اعلان میں مملکت اسلامیہ کے تمام شہریوں کو جان، مال اور آبرو کی حرمت کا بنیادی حق عطا کیا گیا ہے جس کا بہرحال ہر اس ریاست کو التزام کرنا ہوگا جو "اسلامی ریاست" کے نام سے موسوم ہو۔[1]

(۲) یہ حرمت کس حال میں کس طرح ٹوٹ سکتی ہے؟ اس کا تعین نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

فاذا فعلوا ذالک عصموا منی دماءھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ (بخاری ومسلم)

پھر جب لوگ یہ کام (یعنی شہادت توحید و رسالت اور اقامتِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ) کر دیں تو وہ اپنی جانیں مجھ سے بچا لیں گے، اِلّا یہ کہ اسلام کے کسی حق کی بنا پر وہ مجرم ہوں، اور ان کی نیتوں کا حساب لینا اللہ کے ذمے ہے۔

فقد حرمت علینا دماؤھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ (بخاری)

پس ان کی جان و مال ہم پر حرام ہیں اِلّا یہ کہ جان و مال ہی کا کوئی حق ان پر قائم ہو۔ اور ان کے باطن کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

[1] اگرچہ اس حدیث میں صرف مسلمانوں کے بنیادی حقوق کا ذکر ہے، لیکن اسلامی شریعت کا یہ مسلّم اصول ہے کہ جو غیر مسلم اسلامی ریاست کی حفاظت میں رہنا قبول کریں ان کو دیوانی اور فوجداری قانون کی نگاہ میں وہی حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فمن قالها فقد عصم منی ماله و نفسه الا بحقه و حسابه علی اللہ ۔ (بخاری)

پھر جو اس کا یعنی کلمۂ توحید کا، قائل ہو جائے اس نے مجھ سے اپنا مال اور اپنا نفس بچا لیا الا یہ کہ اللہ کا کوئی حق اس پر قائم ہو، اور اس کے باطن کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

یہ احادیث اس باب میں ناطق ہیں کہ اسلامی ریاست میں کسی شہری کی آزادی نفس اور حرمت جان و مال و آبرو پر کوئی دست درازی نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اسلامی قانون کی رو سے اُس پر یا اس کے خلاف، کوئی حق ثابت نہ کر دیا جائے۔

(۳) کسی پر یا کسی کے خلاف، حق کا اثبات کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم یوں بیان فرماتے ہیں:

اذا جلس الیك الخصمان فلا تقض بینهما حتی تسمع من الاخر کما سمعت من الاول (ابوداؤد، ترمذی، احمد)

جب تیرے سامنے دو فریق اپنا معاملہ لے کر بیٹھیں تو ان کا فیصلہ نہ کر جب تک کہ دوسرے کی بات بھی نہ سن لے جس طرح پہلے کی سنی ہے۔

اور حضرت عمرؓ ایک مقدمے کے فیصلے میں تصریح کرتے ہیں:

لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر العدل (موطا)

اسلام میں کوئی شخص عدل کے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا۔

اس مقدمے کی جو تفصیل مؤطا میں دی گئی ہے اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عراق کے نومفتوح علاقے میں لوگ جھوٹی چغلیاں کھا کھا کر دوسروں کو پکڑوا رہے تھے۔ اس کی شکایت جب حضرت عمرؓ کے پاس لائی گئی تو آپ نے اس کے فیصلے میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں عدل سے مراد معروف عدالتی کارروائی (due process of law) ہے یعنی ایک آدمی کا جرم کھلی عدالت میں ثابت کیا جائے اور اسے صفائی کا پورا موقع دیا جائے۔ اِس کے بغیر اسلام میں کوئی شخص قید نہیں کیا جا سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دہم، حضرت علیؓ کے زمانے میں جب خوارج کا ظہور ہوا، جو سرے سے ریاست ہی کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے، تو آپ نے انہیں لکھا کہ:-

کونوا حیث شئتم وبیننا وبینکم الا تسفکوا دما ولا تقطعوا سبیلا ولا تظلموا احداً فان فعلتم نبذت الیکم الحرب (نیل الاوطار)	تم جہاں چاہو رہو۔ ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خون نہ بہاؤ اور بدامنی نہ پھیلاؤ اور کسی پر ظلم نہ کرو۔ اگر ان کاموں میں سے کوئی کام تم نے کیا تو میں تمہارے خلاف جنگ کروں گا۔

یعنی خیالات تم جو چاہو رکھو، تمہارے خیال اور نیت پر گرفت نہ کی جائے گی۔ البتہ اگر تم اپنے خیالات کے مطابق حکومت الٹ دینے کی کوشش کرو گے تو یقیناً تمہارے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

ان تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ اسلامی تصورِ عدل کسی حال میں بھی انتظامیہ کو یہ اختیارات دینے کا روادار نہیں ہے کہ وہ معروف عدالتی کارروائی کے بغیر جس کو چاہیں پکڑیں، جسے چاہیں قید کر دیں، جسے چاہیں خارج البلد کریں، جس کی چاہیں زبان بندی کر دیں اور جسے چاہیں اظہارِ رائے کے وسائل سے محروم کر دیں۔ اس طرح کے اختیارات جو ریاست اپنی انتظامیہ کو دیتی ہو وہ اسلامی ریاست ہرگز نہیں ہو سکتی۔

پھر حکم بین الناس میں عدل برتنے کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہم کو اسلام کی مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں صدرِ ریاست اور گورنروں اور اعلیٰ حکام اور عامۃ الناس، سب کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظامِ عدالت ہے۔ کسی کے لیے کوئی قانونی امتیاز نہیں ہے، کسی کے لیے خاص عدالتیں نہیں ہیں، اور کوئی قانون کی پکڑ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت میں خود اپنے آپ کو پیش کیا کہ جس کو میرے خلاف کوئی دعویٰ ہو وہ لائے اور اپنا حق وصول کرے۔ حضرت عمرؓ نے ایک والیٔ ریاست، جبلہ بن ایہم غسانی سے ایک بدوی کو قصاص دلوایا۔ حضرت عمرو بن العاص نے گورنروں کے لیے قانونی تحفظ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا مطالبہ کیا تو حضرت عمرؓ نے اسے ماننے سے صاف انکار کر دیا اور عام لوگوں کو یہ حق دیا کہ جس حاکم کے خلاف انہیں شکایت ہو اسے کھلی عدالت میں لائیں۔

(۱۰)

وَفِيٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات - ۱)

ان کے مالوں میں حق تھا مدد مانگنے والے کے لیے اور رزق سے محروم رہ جانے والے کے لیے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ۔ (التوبہ - ۱۳)

ان کے مالوں میں سے صدقہ وصول کر کے ان کو (بری صفات سے) پاک کرو اور ان کو (اچھی صفات میں) بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو۔

ان اللہ قد فرض علیھم صدقۃ تؤخذ من اغنیاءھم فترد علٰی فقراءھم (بخاری و مسلم)

اللہ نے مسلمانوں پر ایک صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مالداروں سے لیا جائے گا اور ان کے حاجتمندوں پر لوٹا دیا جائے گا۔

السلطان ولی من لا ولی لہٗ (ابوداؤد۔ ترمذی۔ مسند احمد۔ ابن ماجہ۔ دارمی)

حکومت اس کی سرپرست ہے جس کا کوئی سرپرست نہ ہو۔

من مات وعلیہ دَین ولم یترک وفاءً فعلیَّ قضاءُہ ومن ترک مالا فلورثتہ۔

جو شخص مر جائے اور اس کے ذمے قرض ہو اور وہ اسے ادا کرنے کے قابل مال نہ چھوڑے تو اس کا ادا کرنا میرے ذمے ہے اور جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔

وفی روایۃٍ من ترک دیناً او ضیاعاً فلیاتنی فانا مولاہ

ایک دوسری روایت میں ہے جو شخص قرض چھوڑے یا ایسے پسماندگان چھوڑ جائے جن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو وہ میرے پاس آئیں، میں ان کا سرپرست ہوں۔

وفی روایۃ من ترک مالاً

ایک اور روایت میں ہے جو مال چھوڑے تو وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فلورثته ومن ترك كلا فالينا۔ — اس کے وارثوں کا حق ہے اور جو ذمہ داریوں کا بار چھوڑ جائے

(بخاری و مسلم) — تو وہ ہمارے (یعنی حکومت کے) ذمے ہے۔

انا وارث من لا وارث له اعقل عنه وارثه (ابوداؤد) — جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا میں وارث ہوں۔ اس کی طرف سے دیت ادا کرونگا اور اس کی میراث لونگا۔

یہ آیات اور احادیث تصریح کرتی ہیں کہ اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ایک اہم فرض زکوٰۃ کی تنظیم ہے اور اس کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے حدود کے اندر تمام اُن لوگوں کی کفیل بنے جو مدد کے محتاج ہوں اور وسائل رزق سے محروم رہ گئے ہوں۔

یہ ہیں وہ بڑے بڑے دستوری احکام جو ہم کو کتاب و سنت میں ملتے ہیں۔ اگرچہ دستوری مسائل سے متعلق قرآن اور حدیث میں اور بھی بہت سی ہدایات موجود ہیں، مگر چونکہ ان کا تعلق دستور سے کم اور دستوری قانون سے زیادہ ہے اسلیے ہم نے ان کو یہاں بیان نہیں کیا ہے۔ اب ہر شخص جو دستور کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو، ہماری پیش کردہ ان آیات و احادیث کو دیکھ کر خود رائے قائم کرے کہ آیا ان میں ایک اسلامی ریاست کی اصولی بنیادیں صاف صاف بیان کردی گئی ہیں یا نہیں! اگر کوئی صاحب محض دعووں کے بجائے علمی استدلال سے ثابت کردیں کہ ان احکام کا دستور سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور ہمیں بتائیں کہ دستور کے وہ کونسے بنیادی مسائل (تفصیلات نہیں بلکہ بنیادی مسائل) ہیں جن میں کتاب و سنت سے کوئی رہنمائی نہیں ملتی تو ہم ضرور ان کے شکر گزار ہونگے لیکن اگر یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مسائل جن پر ہم نے اوپر بحث کی ہے دستوری مسائل نہیں ہیں، اور نہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان مسائل پر قرآن و حدیث کی ان تعلیمات سے کوئی روشنی نہیں پڑتی، تو اس کے بعد غیر منافق شرفاء کے لیے دو ہی راستے کھلے رہ جاتے ہیں۔ یا تو وہ سیدھی طرح ان احکام کو تسلیم کریں اور ملک کے دستور میں ان کو ثبت کر کے باقی تفصیلات جس طرح مناسب سمجھیں مرتب کرتے رہیں۔ یا پھر صاف صاف کہہ دیں کہ ہم نہ قرآن کو مانتے ہیں نہ سنت کو، ہمارا ایمان اُس ڈیموکریسی پر ہے جس کا اسوۂ حسنہ ہم کو امریکہ اور انگلستان اور ہندوستان کے دستور سلطنت میں ملتا ہے۔ ان دو راستوں میں سے جو راستہ بھی وہ اختیار کریں گے، بہر حال وہ راستبار انسانوں کے شایان شان ہوگا۔ رہا یہ طریقہ کہ سامنے آفتاب نصف النہار پر چمک رہا ہو اور آدمی کہے جائے کہ روشنی کہیں موجود نہیں ہے تو اس سے لوگ فریب کھائیں یا نہ کھائیں مگر کہنے والا اپنی عزت ضرور کھو دیتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی نظامِ تعلیم

اور

پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر

[یہ وہ تقریر ہے جو اسلامی جمعیتہ طلبہ کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ۵ ار فروری ۱۹۵۲ء کو برکت علی محمڈن ہال لاہور میں کی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ عدیم الفرصتی کے باعث اب تک اسے اشاعت کی خاطر مرتب کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس لیے اسے اتنی تاخیر کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے]

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین۔

جناب صدر! اور حاضرین و حاضرات!!

جس مسئلے پر مجھے آپ کے سامنے اظہارِ خیال کرنا ہے وہ یہ ہے کہ "اسلامی نظامِ تعلیم کو اس ملک میں رائج کرنے کی عملی صورت کیا ہے؟" میں نے اپنی تقریر کے لیے یہ موضوع اختیار نہیں کیا ہے کہ "اس ملک میں کونسا نظامِ تعلیم جاری ہو؟" اس لیے کہ یہ مملکت اسلام ہی کے نام پر بنائی گئی ہے، اس کے قیام کا مطالبہ ہی اسلام پر مبنی تھا، اس کے متعلق اوّل روز سے کہا جاتا رہا ہے کہ ہم ایک الگ خطۂ زمین اس لیے چاہتے ہیں کہ اس میں اسلامی تہذیب اور اسلامی نظامِ زندگی کو از سرِ نو زندہ اور قائم کیا جائے، اور تقدیرِ الٰہی بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ اسے لازماً اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا مرکز بننا ہے اس لیے اب یہاں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ کس قسم کا نظامِ تعلیم اس ملک میں رائج ہو۔ بلکہ یہ امر طے شدہ سمجھنا چاہیے کہ یہاں اسلامی نظامِ تعلیم ہی کو رائج ہونا ہے۔ البتہ اگر کوئی چیز زیرِ غور ہونی چاہیے اور ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ یہاں کے نظامِ تعلیم کو اسلام کے سانچوں میں ڈھالنے کے

© rasailojaraid.com